محمد جعفر پھلواروی

غزوۂ بدر

واقعہ نخلہ یعنی قتل عمرو بن حضرمی کے دو ماہ بعد قریش مکہ کا ایک تجارتی قافلہ ابوسفیان (صخر بن حرب) کی سرکردگی میں شام سے مکہ روانہ ہوا۔ قافلے میں تیس یا چالیس آدمی تھے اور ایک ہزار اونٹ زر و مال اور اسباب تجارت سے لدے ہوتے تھے۔ یہ سارا مال قریش کے مختلف افراد کا تھا۔ شام سے مکہ جانے والے کو مدینہ کے پاس ہی سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا، اس لئے ابوسفیان کو قدرۃً یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں مدینے کے اہل اسلام اس مختصر سے قافلے پر حملہ کر کے جان و مال کو نقصان نہ پہنچائیں اس لئے ابوسفیان نے ضمضم بن عمرو غفاری کو ایک تیز رفتار اونٹنی پر مکہ بھیج دیا۔ اس نے مکہ پہنچ کر زور دار دہائی دی کہ: "اے قریشیو! المدد، المدد، تمہارا مال و اسباب ابوسفیان کے قافلہ کے ساتھ آ رہا ہے۔ اور محمدؐ اور اصحاب محمدؐ درمیان میں حائل ہونے والے ہیں"۔

ابوسفیان نے مکہ جانے کے لئے معروف راستے کو ترک کر کے سمندر کے کنارے کنارے جانے والا راستہ اختیار کیا اور پورا قافلہ صحیح سلامت مکہ پہنچ گیا۔ جب یہ قافلہ مکہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ ضمضم بن عمرو غفاری کی فریاد پر قریشی کمک روانہ ہو چکی ہے۔ بعد میں ابن اسحاق کی روایت کے مطابق ابوسفیان نے اس کمک کو پیغام بھیجا کہ جس قافلۂ تجارت کی حمایت و حفاظت کے لئے تم جا رہے تھے وہ صحیح سلامت واپس آ گیا ہے اس لئے اب خواہ مخواہ جنگ کے لئے نکلنے کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن ابوجہل بن ہشام نے کہا کہ بدر کے سالانہ میلے کی شرکت تو ضرور کرنی چاہیئے، تاکہ ہم اپنی جمعیت اور شان و شوکت سے سارے عرب کو مرعوب کر دیں۔ مگر بنی عدی اور بنی زہرہ کے تمام افراد ابوسفیان کی رائے پر عمل کرتے ہوئے واپس آ گئے۔

ادھر حضورؐ کو بھی قریش کی روانگی کی اطلاع ملی۔ لہٰذا ۱۲ رمضان ۲ھ کو حضورؐ تین سو تیرہ آدمیوں کو لے کر روانہ ہوگئے۔ ان میں ساٹھ یا ستر سے کچھ زیادہ مہاجرین تھے اور باقی انصار۔ روانگی کے وقت عبداللہ بن ام مکتوم کو امامِ نماز مقرر فرمایا۔ بعد میں مقام روحاء سے ابولبابہ کو مدینے کا عامل بنا کر واپس بھیج دیا۔ اور مدینے کے بالائی حصّے کا نگران عاصم بن عدی کو متعین فرمایا۔ اس وقت ایک سفید جھنڈا مصعب بن عمیر کے ہاتھ میں تھا۔ ایک سیاہ جھنڈا، جس کا نام عقاب تھا حضرت علیؓ کے ہاتھ میں اور دوسرا سیاہ جھنڈا سعد بن معاذ یا حباب بن منذر کے ہاتھ میں تھا۔ گھوڑے صرف دو تھے اور زرہیں ساٹھ۔ اور ہر تین آدمیوں کے درمیان ایک اونٹ کی سواری تھی جس پر باری باری سے دو دو آدمی سوار ہوتے تھے حضورؐ کے ساتھیوں میں علیؓ اور ابولبابہ تھے۔ ان دونوں نے خواہش ظاہر کی کہ صرف حضورؐ سوار ہوں اور ہم دونوں پیدل چلیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا:

ما انتما باقوی منی ولا انا باغنی عن الاجر منکما۔ — تم دونوں مجھ سے زیادہ قوی نہیں اور میں تم دونوں سے اجر الٰہی کا کم محتاج نہیں (رواہ احمد عن ابن مسعود)

اللہ اللہ کیا بندگانہ انکسار، مساواتِ حقوق، مسکین نوازی اور فقیرانہ زندگی کی اس سے بہتر بھی کوئی مثال مل سکتی ہے؟ عام طور پر سردارانِ قوم جس انداز سے نکلتے ہیں وہ کوئی پوشیدہ چیز نہیں۔ لیکن یہاں سرورِ کونین جن انسانی و اخلاقی اقدار کو قائم کرنے آئے تھے اس کا ہر ہر قدم پر مظاہرہ ہو رہا تھا۔ مقام روحاء سے جب ابولبابہ عامل مدینہ بنا کر واپس کئے گئے تو مرثد ابن ابی مرثد نے ان کی جگہ لے لی۔

جب حضورؐ مقام ذفران پر پہنچے تو حضورؐ کو اطلاع ملی کہ فی الواقع قریش اپنے تجارتی قافلے کے لئے روانہ ہو چکے ہیں اور اب کچھ زیادہ دور نہیں۔ ابوجہل نے اگرچہ محض بدر کے میلے میں شرکت کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہاں سے فارغ ہو کر وہ مدینہ پر حملہ نہ کر دے گا؟ مکّہ سے دو سو بیس میل چل کر جو لشکر بدر میں پہنچا ہو اور مدینہ صرف ساٹھ میل

رہ گیا ہو، وہاں عقل و سیاست کا ایک ہی تقاضا ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے مزید اقدام کو روک دیا جائے۔ ایسا کرنا عین مدافعت ہی کا تقاضا ہے۔ مدافعت کے یہ معنی نہیں کہ جب مسلح دشمن گھر میں گھس آئے اور تلوار چلانی شروع کر دے تب تم مدافعت کے لئے اٹھو۔

خطرہ اب سر پر آ چکا تھا اس لئے لشکر قریش کی خبر سنتے ہی حضورؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے گویا مہاجرین کی نمائندگی کرتے ہوئے پوری امداد کا وعدہ کیا۔ مگر حضورؐ کو انصار کے جواب کا انتظار تھا جو اس وقت مہاجرین سے سہ چند زیادہ تھے۔ حضورؐ کا یہ انتظار محسوس کر کے مقداد بن عمرو (یا مقداد بن اسود) بولے کہ: یا رسول اللہ ہم وہ بنی اسرائیل نہیں جنہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا کہ، اذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون۔ (تم اور تمہارا خدا جا کر جنگ کرو۔ ہم یہیں سے بیٹھ کر تماشا دیکھیں گے) بخدا اگر حضورؐ ہمیں لے کر برک غماد تک بھی لے جائیں تو ہم وہاں بھی جانے کو بھی حاضر ہیں۔ سعد بن معاذ نے کہا کہ ہم حضورؐ کے ہاتھ پر سمع و طاعت کی بیعت کر چکے ہیں اور حضورؐ کی دعوت پر ایمان لا چکے ہیں۔ خدا کی قسم ہمیں اگر سمندر میں بھی کودنا پڑا تو ہم میں سے کوئی پیٹھ نہیں دکھائے گا۔

حضورؐ یہ جواب سن کر خوش ہوئے اور جیش اسلامی روانہ ہو کر ایک مقام پر فروکش ہوا۔ آج ماہ رمضان کی سترھویں تاریخ تھی جمعہ کا دن تھا۔ یہ میدان بدر تھا۔ جہاں بدر نبوت اپنے تین سو تیرہ ستاروں کے ساتھ خیمہ زن ہوا۔ یہاں مختلف ذرائع سے معلوم ہو گیا تھا کہ لشکر قریش دوسری جانب یہیں پڑاؤ ڈال چکا ہے۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق اس قریشی لشکر میں تقریباً ایک ہزار نبرد آزما تھے، جن میں چھ سو زرہ پوش اور دو سو گھوڑے تھے۔ نو دس اونٹ روزانہ ذبح کئے جاتے تھے۔

حضورؐ نے اس میدان میں ایک جگہ منتخب فرمائی تو ایک صحابی حباب بن منذر بن جموح نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا یہ جگہ حضورؐ نے خدا کے حکم سے پسند فرمائی ہے جس میں کوئی رد و بدل نہ ہو سکے یا جنگی تدبیروں کے پیش نظر حضورؐ کی اپنی رائے ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ: یہ اپنی صوابدید ہے، جنگی تدبیر کے مطابق — حبابؓ نے عرض کیا کہ فلاں جگہ جو پانی سے قریب بھی ہے زیادہ موزوں ہے۔

وہاں کے نشیب میں ہم ایک حوض بنا کر نالی کے ذریعے سارا پانی کھینچ سکتے ہیں۔ حضورؐ نے حبابؓ کی رائے کو مان لیا اور انھیں کی بتائی ہوئی رائے پر عمل فرماتے ہوئے جگہ بدل لی۔

لمحۂ فکریہ

یہ روایت ابن اسحاق کی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے اور غلط ہونے کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں جو بڑے اہم ہیں:

۱۔ حضورؐ ہر بات وحی سے ہی نہیں فرمایا کرتے تھے اس لیے حضورؐ کے ہر قول و فعل کو جو احادیث میں موجود ہے غیر متبدل وحی قرار دینا یقیناً درست نہیں۔

۲۔ حضورؐ کی رائے کا فنی طور پر صحیح ہونا ضروری نہیں۔ لہٰذا

۳۔ حضورؐ کی رائے سے اختلاف کرنا کوئی معصیت نہیں بلکہ حضورؐ کو حکم خداوندی تھا کہ شاورھم فی الامر (ان سے مشورہ کر لیا کیجئے) اور ظاہر ہے کہ مشورے میں حضورؐ کی رائے سے اتفاق اور اختلاف دونوں ہو سکتے ہیں اور ایسا بارہا ہوا ہے اور متعدد مواقع پر حضورؐ نے اپنی رائے پر دوسروں کی رائے کو ترجیح عطا فرمائی ہے۔ حضورؐ انسانوں کو حریتِ ضمیر کی جو نعمت بخشنا چاہتے تھے اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ حضورؐ جیسی شخصیت کی ذاتی رائے سے بھی اختلاف کا دروازہ بند نہ رہے۔

۴۔ وحی خداوندی کے آگے سب کے سب حتیٰ کہ خود حضورؐ بھی بے اختیار ہیں۔ اسی لیے حضرت حبابؓ بن منذر نے عرض کیا تھا کہ کیا یہ جگہ بحکم خداوندی پسند فرمائی ہے جس میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہو سکتی؟ حضورؐ کی تو بعثت ہی اسی لیے ہوئی تھی کہ خود بھی وحی کی پابندی فرمائیں اور دوسروں کو بھی پابند بنائیں۔ دوسروں سے تو کسی وقت وحی سے بے اعتنائی کی غلطی ہونا ممکن ہے۔ لیکن حضورؐ کے متعلق اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

۵۔ صحابہ عام طور پر سمجھ لیا کرتے تھے کہ حضورؐ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ وحی سے فرما رہے ہیں یا وہ ذاتی رائے ہے۔ لیکن جب اس میں شبہ ہوتا تو حباب بن منذر کی طرح دریافت کر لیتے

تھے۔ وہ اپنی رائے اسی وقت دیتے تھے جب یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ حضورؐ کی اپنی رائے ہے۔ لیکن اگر حضورؐ بحیثیت رسول کے وحی سے کوئی بات فرمانے یا بحیثیت امیر امت حکم و امر (نہ کہ رائے) فرماتے تو کسی کو مجالِ دم زدن نہ ہوتی کیونکہ یہ صریح کفر ہوتا۔

۲۔ اہل فکر کے لئے یہاں ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے اگر پڑاؤ کی جگہ پسند فرمانے کے متعلق کوئی قرآنی حکم نازل ہوا ہوتا تو بقول بلغ ما انزل الیک حضورؐ اسی وقت سب کو بتا دیتے اور حبابؓ بن منذر اس سے بے خبر نہ ہو سکتے تھے اور نہ وہ حضورؐ سے یہ دریافت کرتے کہ کیا یہ جگہ حکم خداوندی سے پسند فرمائی گئی ہے؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قرآنی حکم تو یقیناً نازل نہیں ہوا تھا۔ پھر حبابؓ بن منذر کا دریافت کرنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ کسی ایسی وحی کے بھی قائل تھے جو قرآنی وحی سے الگ نوعیت رکھتی تھی۔ عہد صحابہ میں تو اسے بآسانی معلوم کیا جا سکتا تھا لیکن اب جو ذخیرۂ روایات ہمارے سامنے موجود ہے اس میں بجز حضورؐ کی بعض پیشگوئیوں یا احادیث قدسیہ وغیرہ (وہ بھی اگر معیار صحت پر پوری اتریں) اور کسی حدیث کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ حضورؐ کی غیر قرآنی وحی ہے چہ جائیکہ اسے مشکلہ قرار دیا جائے۔

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ سعدؓ بن معاذ نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ ہم سب حضور کے لئے ایک عریش (سائبان) نہ بنا دیں جس میں حضور تشریف رکھیں؟ اس سے ہمارا عرض یہ ہے کہ حضور کے سامنے ہی ہم روانہ ہو کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ اگر اللہ نے فتح دی تو فبہا۔ اور اگر خدانخواستہ معاملہ کچھ اور رہا تو حضور کے لئے مدینہ واپس تشریف لے جانا اس لئے ضروری ہوگا کہ وہاں کے مسلمانوں کو حضور کی ذات ہم سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔ اگر انہیں یہ علم ہوتا کہ حضور کو جنگ پیش آئے گی تو وہ یقیناً حضور کے ساتھ ہی چل پڑتے۔ سعد بن معاذ کے الفاظ یوں ہیں:

ولو ظنّوا انک تلقی حربا ما تخلفوا عنک۔	اگر انہیں یہ گمان ہوتا کہ حضورؐ کو جنگ پیش آئے گی تو وہ مدینے میں نہ رہتے بلکہ حضورؐ کے ساتھ ہی آ جاتے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی روانگی بدر جنگ کی غرض سے نہ تھی ورنہ سب کو اس کا علم ہو جاتا۔ یہ روانگی اسی قسم کی فوجی نقل و حرکت تھی جیسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ میدان بدر میں آنے کے بعد یہ صورت حال پیدا ہو گئی کہ اگر دشمنوں کو یہیں روک نہ دیا جاتا تو مدینے پر چڑھائی کا قوی اندیشہ تھا۔ قدرت کی طرف سے ایک امداد و انعام یہ ہوا کہ پانی برس گیا۔ جس سے گرد بیٹھ کر زمین خوشگوار ہو گئی اور مسلمانوں کے حوض بھی پانی سے بھر گئے قرآن مجید میں اس کا خاص طور پر یوں ذکر ہے کہ

ولقد نصرکم . . . . . اور یہ بات محقق ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو بدر میں منصور فرمایا حالانکہ تم بے سروسامان تھے سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم شکر گذار رہو۔ جب کہ آپ مسلمانوں سے یوں فرما رہے تھے کہ کیا تم کو یہ امر کافی نہیں ہوگا کہ تمھارا رب تمھاری امداد کرے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ جو اتارے جاویں گے۔ ہاں کیوں نہیں۔ اگر مستقل رہو گے اور متقی رہو گے اور وہ لوگ تم پر ایک دم سے آپہنچیں گے تو تمھارا رب تمھاری امداد فرمائیگا۔ پانچ ہزار فرشتوں سے جو ایک خاص وضع بنائے ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد محض اس لئے کی کہ تمھارے لئے بشارت ہو تاکہ تمھارے دلوں کو قرار ہو جاوے اور نصرت صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے جو کہ زبردست ہیں حکیم ہیں۔ تاکہ کفار میں سے ایک گروہ کو ہلاک کر دے یا ان کو ذلیل و خوار کر دے پھر وہ ناکام لوٹ جاویں۔ آپ کو کوئی فعل نہیں یہاں تک کہ خدا تعالیٰ ان پر یا تو متوجہ ہو جاویں یا ان کو کوئی سزا دیدیں کیونکہ وہ ظلم بھی بڑا کر رہے ہیں۔

ادھر قریش نے عمیر بن وہب کو لشکر اسلامی کا اندازہ کرنے بھیجا۔ عمیر نے آکر بتایا کہ مسلمان کم و بیش تین سو ہیں جن میں سے کوئی کم از کم ایک دشمن کو مارے بغیر خود نہیں مرے گا۔ اس طرح اگر ہمارے تین سو آدمی مارے گئے تو ہماری زندگیاں بے مزہ ہو جائیں گی۔ یہ سن کر حکیم بن حزام سیدھا عتبہ بن ربیعہ کے پاس مشورہ کے لئے گیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ محض ایک شخص عمرو بن الحضرمی کے خون کا بدلہ لینے کے لئے کوئی بڑی خونریزی مناسب نہیں۔ بہتر ہے کہ اس کا خوں بہا ادا کر دیا جائے اور سب لوگ یہاں سے واپس چلے جائیں اگر اہل اسلام خوں بہا نہ دیں تو یہ خون بہا اور

دوسرے مالی نقصانات میں (عتبہ) ادا کردوں گا کیونکہ میں ابن حضرمی کا حلیف ہوں۔ ابوجہل نے طنزاً کہا کہ عتبہ کا فرزند بھی اس وقت چونکہ مسلمانوں کے لشکر میں ہے اس لئے یہ جنگ سے کترا تا ہے۔ اس کے بعد ابوجہل نے عامر بن حضرمی کو اکسایا اور اس نے اپنے مقتول بھائی عمرو بن الحضرمی کی دہائی دینی شروع کی۔ اس دہائی پر عرب کے دستور کے مطابق سب سربکف ہو کر میدان میں آگئے اور عتبہ کو بھی تیار ہونا پڑا۔

ادھر حضورؐ نے خود لشکر اسلامی کی صف بندی فرمائی حضورؐ ایک چھڑی کے اشارے سے صف بندی فرما رہے تھے۔ اتفاق سے سواد بن غزیہ (بنی عدی بن نجار کے حلیف) صف سے ذرا آگے ہو گئے۔ حضورؐ نے ان کے پیٹ میں چھڑی لگا کر پیچھے کیا۔ اس پر سواد بولے کہ آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی۔ آپ کو اگر خدا نے حق اور عدل لے کر بھیجا ہے تو مجھے بدلہ لینے کی اجازت دیجئے۔" اس وقت سواد کے جسم پر کوئی کرتا نہ تھا۔ اس لئے حضورؐ نے اپنا فوراً شکم مبارک کھول کر سواد سے فرمایا کہ لو اپنا بدلہ لے لو۔" اللہ اللہ آج سے پہلے آسمان کی آنکھوں نے نہ سواد بن غزیہ جیسا "گستاخ" اُمتی دیکھا تھا اور نہ محمدؐ جیسا عادل انسان۔ صحابہؓ نے بھی یہ عجیب و غریب منظر کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ سید الانبیاء اپنے ایک ادنیٰ امتی کے سامنے اپنی مطہر و مقدس ذات کو بدلہ لینے کے لئے پیش کرے۔ جاں نثاروں کی آنکھوں میں کس طرح خون اتر رہا ہوگا اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ بہت ممکن تھا کہ کسی صحابی کی تلوار حرکت میں آجاتی اور میدان بدر میں پہلی لاش اسود ہی کی خاک و خون میں غلطاں نظر آتی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سارے واقعات چٹ پٹ ہی ہو گئے اور صحابہ کے عالم تحیّر نے کسی اقدام کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے بھی چشم کائنات نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ ادھر حضورؐ نے اپنے نورانی شکم سے کرتا ہٹایا ادھر اسود دوڑ کر حضورؐ سے لپٹ گیا اور شکم مبارک کو بار بار بوسے دینے لگا۔ پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جنگ سر پہ ہے اس لئے میری تمنا تھی کہ زندگی کی آخری سعادت اس طرح حاصل کرلوں کہ حضورؐ کے بدن سے میرا بدن مس ہو جائے۔ حضورؐ نے اس کے بعد سوادؓ کے لئے دعائے خیر فرمائی۔ اے سواد! تو کتنا خوش بخت ہے اور کتنی مبارک ہیں تیری یہ جیلہ سازیاں۔

صف بندی کے بعد حضورؐ اپنے عریش میں واپس تشریف لے آئے۔ حفاظت کے لئے صرف سیدنا ابوبکرؓ تلوار لئے کھڑے رہے۔ اس دن ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ کو شب کے وقت حضورؐ نے اپنے رب سے راز و نیاز کی باتیں شروع کیں۔ یہ ایک عاشق جو زبانِ رسالت سے کمال عاجزی اور کمال ناز کے ساتھ نکل رہی تھی۔ دعا کے یہ چند الفاظ ہی تھے جو ساری کائناتی قوتوں کو اپنی طرف سمیٹ رہے تھے۔ الفاظ یہ تھے:

اللّٰھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لا تعبد بعدھا فی الارض اللّٰھم انجز لی ما وعدتنی اللّٰھم نصرک۔

بارالٰہا: اگر تو نے اس جماعت مومنین کو ہلاک کر دیا تو اس کے بعد اس زمین پر تیری بندگی کبھی نہ ہوگی خداوندا جو وعدہ تو نے مجھ سے کیا ہے اسے پورا فرما۔ الٰہی تیری مدد درکار ہے۔

دعا کے وقت حضورؐ پر گریہ زاری اور بیخودی کا عالم طاری تھا۔ بار بار دوش مبارک سے چادر سرک جاتی اور حضرت ابوبکرؓ اسے اٹھا کر پھر دوش پر رکھ دیتے۔ حضورؐ کا اضطراب اور گریہ و تضرع جناب ابوبکرؓ سے دیکھا نہ جاتا تھا اس لئے بار بار عرض کرتے کہ "یا رسول اللہؐ! اب بس کیجئے۔ اپنے آپ کو اتنا ہلکان نہ کیجئے۔ اللہ تعالیٰ اپنا وعدۂ مدد ضرور پورا کر کے رہے گا۔" آخر خدائی وعدہ صریح لفظوں میں یوں نازل ہوا:

سیھزم الجمع ویولون الدبر

یہ دشمن شکست کھا کر بھاگیں گے۔

حق و باطل کا پہلا معرکہ

۱۷ رمضان المبارک ۲ھ کی صبح ہے اور حق و باطل کا پہلا معرکہ میدانِ بدر میں شروع ہو رہا ہے۔ حضورؐ نے عین اس موقع پر بھی انسانی اقدار کو ملحوظ رکھا اور حکم دیا کہ آغاز مسلمانوں کی طرف سے نہ ہو۔ صفیں دونوں طرف آراستہ ہو گئیں تو سب سے پہلے اسود بن عبدالاسد مخزومی یہ قسم کھا کر نکلا کہ "میں مسلمانوں کے حوض میں سے پانی پیوں گا۔ یا اسے ڈھا دوں گا ورنہ پھر جان دے دوں گا۔" جب یہ آگے حوض کی طرف بڑھا تو سیدنا حمزہؓ نے اس کی طرف لپک کر اس کے پاؤں پر

زخم لگایا۔ وہ پیٹھ کے بل گرا مگر فوراً اٹھ کر تیزی سے حوض کی طرف گھسٹتا ہوا لپکا مگر حضرت حمزہؓ نے عین حوض کے کنارے ہی پر اس کا کام تمام کر دیا۔

اس کے بعد عتبہ بن ربیعہ اپنے دونوں بھائیوں ـــ شیبہ اور ولید ـــ کولے کر میدان میں نکلا اور دعوتِ مبارزت دی۔ ان کے مقابلے کے لئے تین انصاری ـــ معاذ بن حارث اور عوف بن حارث اور عبداللہ بن رواحہ ـــ مقابلے کے لئے نکلے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ یہ مقابلے میں آنے والے انصار ہیں تو انہوں نے متکبرانہ انداز سے کہا کہ "تم ہمارے جوڑ کے نہیں ہو۔ ہماری قوم قریش کے آدمیوں کو بھیجو" اس پر حضورؐ نے عبیدہ بن حارث، حمزہ بن عبدالمطلب اور علی بن ابی طالب کو بھیجا تھوڑے سے مقابلہ کے بعد حمزہؓ نے عتبہ کو اور علیؓ نے ولید کو ڈھیر کر دیا۔ عبیدہؓ کو شیبہ نے زخمی کر دیا مگر حمزہؓ یا علیؓ نے لپک کر ایک ہی وار میں شیبہ کو ختم کر دیا۔ عبیدہؓ اپنے زخم سے جانبر نہ ہو سکا اور غزوہ بدر کے کچھ دنوں کے بعد آپ نے وفات پائی۔ آخری وقت میں آپ نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ: میں درجۂ شہادت سے محروم تو نہیں رہا؟ حضورؐ نے فرمایا کہ: تم شہید ہو[1]۔

پھر عبیدہ بن سعید بن عاص دشمنوں کی صف سے نکلا۔ یہ لوہے میں غرق تھا۔ مقابلے کے لئے زبیر بن عوام آگے بڑھے مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس پر کس طرف سے وار کیا جائے کیونکہ کوئی جگہ آہن پوشی سے خالی نہ تھی۔ حضرت زبیر کو اس کے خود میں سے آنکھیں نظر آئیں اور یہی جگہ لوہے سے خالی نظر آئی۔ آپ نے ایسی ہوشیاری اور چابک دستی سے برچھی ماری کہ آنکھ کو چھبتی ہوئی اندر گھس گئی اور عبیدہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ برچھی کو باہر نکالنے کے لئے آپ کو اس کے سر پہ پاؤں رکھ کر زور

۱۔ جو قتال فی سبیل اللہ میں مارا جائے اسے قتیل یا مقتول فی سبیل اللہ کہتے ہیں اور شہید اسے کہتے ہیں جس کا عمل اس حقیقت کی شہادت دے کہ اس کی زندگی اور موت سب کچھ اللہ کے لئے ہے۔ لہذا شہید صرف وہی نہیں جو راہ خدا میں مارا جائے۔ زندہ بھی شہید ہے بشرطیکہ اس کی زندگی خدا کیلئے ہو۔ قرآن نے لفظ شہید کو ان معنوں میں نہیں لیا ہے جن میں ہم لیتے ہیں۔ مقتول فی سبیل اللہ کے ساتھ شہادت کو مخصوص کر دینا بعد کی اصطلاح ہے۔ اسی لئے حضورؐ نے عبیدہؓ کو شہید فرمایا۔

سے کھینچنا پڑا۔ یہ برچھی حضورؐ نے زبیرؓ سے مانگ لی تھی جو یکے بعد دیگرے خلفائے راشدین کے پاس بھی رہی اور عبداللہ بن زبیر کے پاس واپس آ گئی۔

عبیدہ بن سعید کے مارے جانے کے بعد گھمسان قسم کے حملے شروع ہو گئے اس لئے اس کی صحیح ترتیب نہیں بیان کی جا سکتی تاہم جستہ جستہ واقعات محفوظ ہیں۔

یہاں ایک چیز پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ دشمنوں کی صف میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کئی وجوہ سے جنگ کرنا نہیں چاہتے تھے اور وہ محض اوپر کے دل سے مجبوراً شریک ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے تھے جو دل سے حضورؐ کی صداقت کے قائل تھے لیکن اظہار کا موقع نہ پا رہے تھے۔ بعض وہ تھے جو اپنی قومی ہاشمی عصبیت کی وجہ سے حضورؐ کا مقابلہ نہ کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً عباسؓ، عقیل، نوفل وغیرہ، اور چند ایسے بھی تھے جو کفر کے باوجود شرافتِ نفس کا جوہر اپنے اندر رکھتے تھے۔ انھیں میں ابوالبختری بن ہشام بھی تھا۔ یہ وہی شریف النفس تھا جس نے شعب ابی طالب کا ظالمانہ محاصرہ و مقاطعہ ختم کرنے میں ابوجہل کی کوئی پرواہ نہ کی اور ایک مسلح جماعت کے ساتھ جا کر سارے بنی ہاشم کو اس گھاٹی سے باہر لے آیا۔ حضورؐ نے ایسے تمام افراد کی نشاندہی فرما دی تھی جو محض اوپر کے دل سے شریک جنگ تھے اور ساتھ ہی یہ فرما دیا تھا کہ ان میں سے جو ملے اسے قتل نہ کرنا کیونکہ یہ جبراً لائے گئے ہیں۔

مگر ہوا یہ کہ مجذر بن ذیاد انصاری سے دورانِ جنگ میں ابوالبختری کی ملاقات ہوئی تو مجذر نے کہا کہ حضورؐ نے تیرے قتل سے منع فرمایا ہے۔ اس لئے تجھے زندہ گرفتار کروں گا۔ ورنہ مقابلے سے ہٹ جا۔ ابوالبختری نے کہا کہ اگر مجھے چھوڑ تے ہو تو میرے ساتھی (جنادۃ بن ملیحہ لیثی) کو بھی چھوڑ دو مجذر نے کہا کہ حضورؐ نے صرف تیرے ہی بارے میں قتل سے باز رہنے کا حکم دیا ہے نہ کہ تیرے ساتھی کے بارے میں۔ ابوالبختری نے کہا کہ پھر میں بھی لڑ کر مروں گا کیونکہ میں قریش کی عورتوں کا یہ طعنہ نہیں سن سکتا کہ ابوالبختری اپنے ساتھی کو چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ گیا۔

اس کے بعد دونوں میں جنگ ہوئی اور ابوالبختری مارا گیا پھر مجذر نے آ کر حضورؐ سے سارا قصہ بیان کیا۔

ایک دوسرا واقعہ اُمیّہ بن خلف کے قتل کا ہے۔ اس سے عبدالرحمان بن عوفؓ کا کبھی معاہدہ ہوا تھا کہ وہ مکّے میں ان کی اور یہ مدینے میں اس کی حفاظت کریں گے۔ بدر کے معرکے میں امیہ بھی آیا ہوا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ میدانِ جنگ ان عہود کی کہیں پابندی نہیں کی جاتی خصوصاً اس صورت میں کہ معاہدہ قومی نہ ہو بلکہ محض انفرادی ہو۔ لیکن حضورؐ اکرم کی بعثت کا مقصد اعلیٰ انسانی اقدار کو قائم کرنا تھا اس لئے عبدالرحمٰنؓ بن عوف خاموشی کے ساتھ اسے لے کر ایک پہاڑی پر چڑھ گئے۔ تاکہ اس کی حفاظت کا عہد پورا کریں۔ اس کا ایک فرزند بھی اس کے ساتھ تھا۔ کہیں حضرت بلالؓ نے اسے دیکھ لیا اور انصار کو آواز دی۔[1] اور چند انصاری اس کے پیچھے لپکے۔ عبدالرحمان نے بہتیری کوشش کی مگر انصار نے ایک نہ سنی۔ پہلے اس کے فرزند کو قتل کیا۔ اس کے بعد اُمیّہ کی طرف بڑھے۔ تو عبدالرحمان اس کو لٹا کر اس پر اوندھے گر گئے تاکہ کسی طرح اس کی جان بچا کر اپنا عہد پورا کریں مگر انصار نے ان کے نیچے سے تلواریں داخل کر کے اسے قتل کر دیا۔ اس کشمکش میں خود عبدالرحمان کا ایک پاؤں بھی زخمی ہو گیا۔ اُمیہ مدینے میں تھا جو عبدالرحمان پر اس کی حفاظت لازم ہوتی۔ نیز یہ معاہدہ صرف عبدالرحمان سے تھا۔ انصار سے نہ تھا۔ اس کے باوجود عبدالرحمان نے آخر وقت تک اس کی جان بچانے کی کوشش کی۔ یہ ہیں وہ اخلاقی قدریں جن کی محافظت جنگ کے میدان میں بھی کی گئی۔ بلالؓ وہی اُمیہ بن خلف کے غلام تھے اور آزاد ہونے کے وقت تک اس نے بلال پر ظلم و ستم کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اس لئے بلالؓ نے انصار کو اس کا پتہ نشان بتا دیا۔ اگر بلالؓ ایسا نہ کرتے تو حضرت عبدالرحمانؓ اس بدترین دشمنِ اسلام کی بھی جان بچا کر اپنا عہد پورا کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔

اسی معرکۂ بدر میں ابوجہل بھی مارا گیا۔ دو نوجوان، معاذ اور معوّذ[2]۔ اس معرکے میں شریک تھے۔ ان کے والد کا نام حارث اور ماں کا نام عفراء ہے۔ ان دونوں نے عبدالرحمان بن عوف

۱۔ بعض روایتوں میں ان کی جگہ معاذ بن عمرو بن جموح کا نام ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔

سے ابوجہل کا پتہ پوچھا اور کہا کہ یہ بدبخت حضورؐ کی شان میں گستاخی کرتا ہے اس لئے آج یا یہ نہیں ہوگا یا ہم نہیں ہوں گے۔ عبدالرحمان بن عوف نے جب اشارے سے بتایا کہ وہ ہے ابوجہل" تو یہ دونوں باز کی طرح جھپٹے اور تھوڑی دیر میں ابوجہل خاک پر تھا۔ عکرمہ بن ابی جہل نے عقب سے حملہ کیا اور ایک وار میں معاذؓ کا بایاں بازو کٹ کر ایک تسمے کے سہارے لٹک گیا مگر معاذؓ اسی حالت میں لڑتے رہے۔ پھر ان کو محسوس ہوا کہ یہ بازو قتال فی سبیل اللہ میں کچھ کام نہیں کر رہا بلکہ کچھ رکاوٹ سا بن رہا ہے۔ لہذا اسے اپنے پاؤں سے دبا کر الگ کر دیا۔

ان بڑے بڑے قریشی سورماؤں کے مارے جانے سے لشکر قریش میں تھڑدلی اور مایوسی پھیل گئی اور ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مسلمانوں نے یہ آثار دیکھے تو ان کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ پھر انہوں نے دشمنوں کو اسیر بھی کرنا شروع کیا۔

اسی دوران میں حضورؐ کے حکم سے عبدالدین مسعود ابوجہل کی لاش کی تلاش میں نکلے دیکھا کہ ایک جگہ پر سسک رہا ہے۔ ابن مسعودؓ نے تلوار لے کر اس کے سینے پر سر رکھ کر اس کا سر کاٹنا چاہا تو وہ بولا: او چرواہے یہ کیا حرکت ہے؟ آپ نے کہا آج تجھ جیسے دشمن خدا کو خدا نے رسوا کیا ہے۔ اس کے بعد جب سر کاٹنے لگے تو اس نے کہا کہ میری گردن نیچے سے کاٹو تاکہ اس کے بعد بھی سر ذرا بلند رہے۔ جب ابن مسعودؓ نے اس کا سر لا کر حضورؐ کے قدموں میں ڈالا تو حضورؐ نے فرمایا: یہ تھا اس امت کا فرعون۔

اس جنگ میں چھ مہاجر اور آٹھ انصار شہید ہوئے۔ دشمنوں میں تقریباً ستر مارے گئے اور اتنے ہی اسیر ہوئے۔ ان مقتولین میں گیارہ وہ تھے جو دارالندوہ میں حضورؐ کو قتل کرنے کی سازش میں شریک تھے۔ یہ چودہ تھے جن میں سے گیارہ بدر میں مارے گئے اور باقی ماندہ تین بالآخر اسلام لے آئے۔

جنگی قیدیوں میں حضورؐ کے چچا عباس بن عبدالمطلب تھے۔ حضورؐ کے عمزاد بھائی عقیل بن ابی طالب بھی تھے۔ حضورؐ کے داماد ابوالعاص بھی تھے۔ نوفل تھے اور جادو بیان خطیب قریش

سہیل بن عمرو بھی تھے۔ جب قیدیوں کا معاملہ مشورے کے لئے سامنے آیا تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ ان سبھوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ عام صحابہ کی بھی یہی رائے تھی اس لئے کہ یہ سارے قیدی گویا اپنے ہی بھائی بند تھے۔ مسلمانوں کی کچھ معاشی ضرورتیں زر فدیہ سے پوری ہو سکتی تھیں لیکن حضرت عمرؓ نے یہ رائے دی کہ یہ سب کفر کے لیڈر ہیں اس لئے ان کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ حضورؐ نے عام رجحان کے مطابق یہ فیصلہ فرمایا کہ ان سے فدیہ لے کر انہیں رہا کر دیا جائے۔

ان میں کچھ لوگ تو ایسے تھے جو زرِ فدیہ ادا کر سکتے تھے اور چند ایسے بھی تھے جو اس کی سکت نہ رکھتے تھے۔ ان کے لئے جو فدیہ مقرر کیا گیا وہ ایسی چیز ہے جو رہتی دنیا تک ہر تشنۂ علم کے لئے شمعِ ہدایت بنی رہے گی۔ رسول امیؐ نے فیصلہ فرمایا کہ ایسے غیر مستطیع قیدیوں کے لئے فدیہ یہ ہے کہ وہ انصار کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔

اس روایت سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ:

(الف) یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ عرب خصوصاً اہل مکہ بالکل جاہل اور ان پڑھ تھے وہ صحیح نہیں۔ پڑھنے لکھنے کا بہت عام رواج تھا ورنہ ان قیدیوں میں سے کوئی بھی تو کہتا کہ میں بچوں کو نوشت و خواند نہیں سکھا سکتا کیونکہ میں خود ان پڑھ ہوں۔

(ب) اس سے اندازہ ہو سکتا ہے تعلیم کا مسئلہ حضورؐ کی نگاہوں میں کتنی اہمیت رکھتا تھا۔

(ج) اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسیروں یا قیدیوں سے فدیہ لیتے وقت ان کی مختلف حیثیتوں اور متفاوت صلاحیتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ آگے معلوم ہوگا کہ جن لوگوں سے زر فدیہ لیا گیا وہ بھی مقدار میں مختلف تھا۔ کسی پر کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالا گیا جو اس کی استطاعت سے باہر ہو۔

قیدیوں کے ساتھ آج بھی مہذب ممالک میں منتقمانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن حضورؐ جو اعلیٰ اقدار قائم فرمانا چاہتے تھے اور مواقع جنگ پر بھی ان اقدار کو برقرار رکھنا چاہتے تھے

ان کے اظہار کا آج یہ پہلا موقع ہے جبکہ قیدیوں پر نہ فقط یہ کہ استطاعت سے باہر بوجھ نہیں ڈالا جاتا اور کوئی منتقمانہ کارروائی نہیں کی جاتی بلکہ ان قیدیوں کا بیان ہے کہ یہ مسلمان خود سوکھی کھجوروں پر گذارا کر لیتے تھے اور ہمیں پکی ہوئی روٹیاں کھلاتے تھے۔ ہمیں ندامت ہوتی اور ہم انہیں روٹیاں واپس کرنا چاہتے تو وہ انکار کر دیتے۔

لمحہ فکریہ

ذرا سوچئے کہ اہل اسلام تیرہ سال تک مکے میں انتہائی مظلومیت کی زندگی بسر کرتے رہے اور آخر کار گھر بار اور املاک سے محروم کر کے نکال دیئے گئے۔ مدینے پہنچنے کے بعد بھی انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا۔ اس کے بعد کفر و اسلام کا پہلا مقابلہ ہوا جس میں کفر کو شکست فاش ہوئی۔ جو بھاگے یا مارے گئے ان کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں۔ لیکن جو قیدی ہاتھ آئے تھے ان سے انتقام لینے کا آج سے بہتر کون سا موقع ہو سکتا تھا؟ اگر انتقامی کارروائیاں کی جاتیں تو یہ عام تقاضائے بشریت ہوتا۔ لیکن انتقام تو الگ رہا یہاں تو خشک کھجوریں کھا رہے ہیں اور قیدیوں کو پکی پکائی روٹیاں کھلا رہے ہیں ان کا مقصد نہ حصول اقتدار تھا نہ اقتدار کے نشے میں کوئی منتقمانہ کارروائی کرنی۔ ان کو جو تعلیم دی گئی اور جسے پھیلانا ان کا مقصد تھا وہ انسانی اقدار کے قیام کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان ہی اقدار میں قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا بھی تھا۔

صرف کھانے کا خیال نہیں رکھا گیا بلکہ جن لوگوں کو کپڑوں کی ضرورت تھی انہیں حضورؐ نے کپڑے بھی دیئے۔ عباس بن عبدالمطلب ذرا دراز قامت تھے۔ ان کے جسم پر کوئی کرتا ٹھیک نہ آیا تو راس المنافقین عبداللہ ابن اُبی بن سلول سے کرتا لے کر انھیں دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس منافق کے مرنے کے بعد حضورؐ نے جو اپنا قمیص اتار کر اسے کفنانے کے لئے دیا تو درحقیقت اس کے اسی احسان کا بدلہ تھا۔

جب ذی استطاعت قیدیوں سے زرِ فدیہ وصول کیا جانے لگا تو ان قیدیوں کے رشتہ داروں نے مطلوبہ رقمیں بھجوائیں یا جن کے پاس رقم موجود تھی انھوں نے خود ہی ادا کر دی

یہ آپ کو بھی معلوم ہو گا کہ حضورؐ کی صاحبزادی سیّدہ زینب کو ان کے شوہر ابوالعاص نے مکّے میں روک لیا تھا اور حضورؐ کے پاس مدینے میں نہ جانے دیا۔ اب جو ابوالعاص قید ہوئے اور ان سے زرِ فدیہ طلب کیا گیا تو ان کے پاس وہ موجود نہ تھا لہٰذا ان کا زرِ فدیہ حضرت زینبؓ نے مکّے سے بھجوایا۔ اس رقم فدیہ میں حضرت زینبؓ نے اپنا قیمتی ہار بھی بھیجا تھا۔ یہ وہ ہار تھا جو سیّدہ خدیجہؓ کے ترکے میں حضرت زینبؓ کو ملا تھا۔ حضورؐ کی نظر جب اس ہار پر پڑی تو وہ رفیقۂ حیات یاد آگئی جو اس سقفِ آسمانی کے نیچے سب سے پہلے ایمان لائی تھی اور جس نے حضورؐ کی رفاقت میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ آہ دنیا میں کب کہیں یہ موقع آیا ہو گا کہ بیٹی اپنے شوہر کو رہا کرانے کے لئے اپنی ماں کا ترکہ اپنے باپ کے پاس بھیج رہی ہے۔ یہ منظر کتنا دلسوز ہو گا اس کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟ حضورؐ کی نظر ہار پر پڑی تو سراپا اخلاص خدیجہ یاد آگئیں اور چشمانِ مبارک آبدیدہ ہو گئیں۔

ذرا اس کشمکش کا اندازہ کیجئے کہ ایک طرف رفیقۂ حیات کی یاد اور بیٹی کی محبت جذباتِ بشری کو ابھار رہی ہے کہ ساری کائنات بیٹی کے حوالے کر دو۔ اور دوسری طرف تقاضائے عدلِ مقتضائے جمہوریت، احترامِ قانون اور ایک اعلیٰ نصب العین کی راہ میں قربانیاں دینے والے جانثاروں کا لازمی لحاظ مجبور کر رہا ہے کہ جو برتاؤ غیروں کے ساتھ ہو وہی اپنوں کے ساتھ بھی ہو اور قرابت داری پر رفقا کی دلداری کو ترجیح دو ــــ اگر حضورؐ اشارۃً بھی اپنی طرف سے حکم دے دیتے کہ یہ ہار اور سارا زرِ فدیہ واپس کر دیا جائے اور ابوالعاص کو یوں ہی رہا کر دیا جائے تو کون بدبخت تھا جو حضورؐ کے اس حکم سے انکار کر دیتا؟ مگر حضورؐ نے اپنے بشری جذبات پر قومی عدل کو اور ذاتی حکم پر اقدارِ جمہوریت کو ترجیح دی اور صحابہ سے فرمایا کہ اگر تمہاری مرضی ہو تو یہ ہار ــــ ماں کا ترکہ ــــ بیٹی کو واپس کر دیا جائے۔ سب نے تسلیم خم کر دیا، ہار زینبؓ کو واپس کر دیا گیا اور ابوالعاص رہا ہو کر چلے گئے اور حضرت زینبؓ کو مدینہ جانے کی اجازت دے دی۔

سچ پوچھئے تو یہ عنایت بھی محض بیٹی کی خاطر نہ تھی۔ اس میں ایک بڑی مصلحت اور تھی جسے

صرف پیغمبر کی عقابی نظریں ہی دیکھ سکتی تھیں۔ بدر کے چند سال بعد ہی ابوالعاص شام سے ایک قافلہ تجارت لے کر واپس آ رہے تھے کہ مسلمانوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ مسلمانوں نے ان کے تمام مال واسباب لے کر آپس میں بانٹ لئے۔ حضورؐ کو علم ہوا تو یہ انتقامی کاروائی پسند نہ آئی کیونکہ فی سبیل اللہ کسی اعلیٰ نصب العین کی راہ نظر نہ آئی۔ اس لئے فرمایا کہ اگر تم مناسب سمجھو تو ابوالعاص کا مال ان کو واپس کر دو۔ حضورؐ کے حکم کے آگے سب نے سرِ تسلیم جھکا دیا۔ اور ایک ایک تنکا واپس کر دیا۔ ابوالعاص مکہ آئے تو تمام لوگوں کو ان کا مال واسباب واپس کر کے اپنا حساب کتاب بالکل بے باق کر دیا اور مکے سے روانہ ہو کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ابوالعاص شرکاء کی رقم لے کر فرار ہو گئے۔ مدینے پہنچ کر وہ اسلام لے آئے۔ یہ تھا وہ کردار نبوی جس کے صدقے میں ابوالعاصؓ کو اسلام کی دولت نصیب ہوئی۔ یہ محض اپنے ایک داماد کی جانبدارانہ ہمدردی کا معاملہ نہ تھا۔ ادھر اہل اسلام کو یہ اعلیٰ تعلیم دی کہ کسی کو کمزور پا کر لوٹ لینا اور اپنے انتقام کی آگ کو سرد کرنا کوئی جہاد فی سبیل اللہ نہیں اور ادھر اپنی بلند کرداری سے ابوالعاص کو اس طرح متاثر کیا کہ ہار واپس کیا تو زینب کو مدینے جانے کی اجازت مل گئی اور مال تجارت واپس کیا تو وہ دولت اسلام سے مالا مال ہو گئے۔ حضورؐ کی یہ عنایت صرف ابوالعاصؓ ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی جسے نعوذ باللہ داماد کی پاسداری سے تعبیر کیا جائے۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ایسے بہتر سے مواقع آئے ہیں جہاں اپنوں اور بیگانوں سبھوں کے ساتھ حضورؐ نے ایسی ہی دریا دلی فرمائی ہے اور اس کا مقصد تالیف قلب کے سوا کچھ نہ تھا۔

سب سے بڑی اور قابل توجہ بات تو یہ ہے کہ حضورؐ نے سارے مسلمانوں کی جان و مال کے واحد متصرف ہونے کے باوجود یہ نہ کیا کہ محض اپنا حکم چلایا ہو اور دوسرے یاروں انصار کی دلشکنی کی پرواہ نہ کی ہو۔ سرکار دوعالمؐ کی یہی وہ دلداریاں ہیں جنھوں نے فداکاروں کو اور زیادہ فداکار بنا دیا۔

بدر کے قیدیوں میں خطیب قریش سہیل بن عمرو بھی تھے جو آگے چل کر ۶ھ میں بموقع صلح حدیبیہ سفیر قریش بن کر آئے۔ یہ اپنے زور خطابت سے قبائل میں آگ لگا دیتے تھے اور حضورؐ کے خلاف لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ سہیل کے سامنے کے دانت

تڑوا دیئے جائیں تاکہ ان کی طاقتِ لسانی ختم ہو جائے۔ مگر نگاہِ نبوت جس طرح ابو العاص کے مستقبل کو دیکھ رہی تھی اسی طرح سہیل کے آنے والے دن کو بھی ملاحظہ کر رہی تھی حضورؐ نے فرمایا کہ : نہیں ان کے دانت یوں ہی رہنے دو شاید اللہ تعالیٰ آئندہ اس سے کوئی اچھا کام لے لے۔ چنانچہ وفاتِ نبوی کے بعد جس مضمون کا خطبہ حضرت صدیقِ اکبرؓ نے مدینے میں دے کر لوگوں کے ہوش و حواس بجا کر دیئے بالکل اسی مضمون کا خطبہ سہیل بن عمرو نے مکہ میں دیا۔ اور ارتداد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو یہ کہہ کر روک دیا کہ "مکے والو! تم نے اسلام لانے میں بڑی تاخیر سے کام لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ارتداد میں تقدیم کی غلطی کر بیٹھو"

انہیں قیدیوں میں عباس، عقیل اور نوفل بھی تھے۔ حضورؐ نے عباس سے خود ان کا اور ان کے دونوں برادر زادوں ـــ عقیل اور نوفل کا فدیہ طلب فرمایا۔ عباس نے کہا کہ میرے پاس رقمِ فدیہ کہاں ہے؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں قریش سے بھیک مانگتا پھروں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ چچا جان! وہ سونا کیا ہوا جو تم نے اپنی بیوی (ام الفضل) کے پاس چپکے سے رکھوایا تھا اور کہا تھا کہ لڑائی سے اگر میں واپس نہ آسکوں تو یہ سونا تمہارے اور بچوں کے (عبداللہ، عبیداللہ، قاسم اور فضل وغیرہ) کام آئے گا۔ حضورؐ کا ارشاد سوال کی صورت میں بالکل واقعے کے مطابق تھا اور اس واقعے کی خبر بجز عباس اور ان کی بیوی کے کسی کو نہ تھی۔ آج حضورؐ کی زبان سے یہ غیبی اطلاع عباس کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی اور وہ بے ساختہ کلمہ شہادت پڑھ اٹھے۔ اس سے پہلے بھی عباسؓ حضورؐ کے پاسداروں ہی میں تھے لیکن اس کی بنیاد صرف حمیتِ جاہلیہ تھی۔ مگر آج یہ ایمانی بنیاد میں تبدیل ہو گئی۔

ان قیدیوں میں عقبہ، نضر اور طعمہ کے سوا کوئی قتل نہیں کیا گیا۔

حق و باطل کا یہ پہلا معرکہ تھا جس میں حق کو فتحِ مبین اور باطل کو شکستِ فاش ہوئی۔ اس قومی مسرت کے ساتھ حضورؐ کو ایک صدمہ بھی اٹھانا پڑا۔ حضورؐ بدر سے واپس تشریف لائے تو حضورؐ کی صاحبزادی رقیہؓ زوجہ عثمانؓ غنی نے رحلت فرمائی۔ مدینہ سے روانگی کے وقت یہ بیمار تھیں اور انہیں کی تیمارداری کے لئے حضرت عثمانؓ غزوۂ بدر میں شرکت نہ فرما سکے۔ حضرت رقیہؓ ہجرتِ حبشہ

ہیں بھی حضرت عثمان کی شریک تھیں اور ہجرت مدینہ میں بھی۔ ان کا شمار مومنین اولین میں تھا۔ اس لئے حضورؐ کو دینی اور خونی دونوں طرح کے صدمے ہوئے لیکن اس صدمے کو حضورؐ نے کوئی ذاتی صدمے سے متجاوز نہ ہونے دیا۔ اسے قومی صدمہ نہ بننے دیا اور فتح بدر کی قومی خوشی کو اس صدمے پر غالب رکھا۔ یوں بھی اسلام دنیا ماتم و غم ہونے کا حامی نہیں اسی لئے اس نے جو دینی تقریبات رکھی ہیں وہ خوشی (عید) کی ہیں۔ غم کے کسی بڑے سے بڑے حادثے کو بھی تقریب غم کی حیثیت نہیں دی گئی۔

قرآن اور غزوہ بدر

چونکہ غزوہ بدر حق و باطل کا پہلا معرکہ تھا اور حق نے شاندار فتح حاصل کی تھی، اس لئے قرآن نے اس کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان تمام آیات کی اگر وضاحت کی جائے تو ایک بڑی ضخیم کتاب بن سکتی ہے لیکن ہمیں چونکہ ان آیات کی تفسیر لکھنی مقصود نہیں اس لئے ہم صرف چند ضروری نکات کا ذکر کریں گے۔

۱۔ ایک آیت کی "شان نزول" کے متعلق غلط فہمی۔

سیرت نگاروں کے علاوہ اہل تفسیر بھی لکھتے ہیں کہ قیدیان بدر کے بارے میں حضرت عمرؓ نے سب کو قتل کرنے کی رائے دی تھی اور باقی لوگوں نے فدیہ لے کر چھوڑ دینے کی رائے دی تھی اور یہی فیصلہ حضورؐ نے دیا۔ یہاں تک تو بات درست ہے اور اس میں کوئی استعجاب نہیں۔ لیکن اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت عتاب نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ عمرؓ ہی کی رائے درست تھی اور فدیہ لینے کی رائے غلط تھی۔ وہ آیت عتاب یہ ہے:

ما کان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض ط تریدون عرض الدنیا و اللہ یرید الاخرۃ، و اللہ عزیز حکیم ہ لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم ہ

کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اس کی منفعت کے لئے قیدی رہ جائیں تا آنکہ وہ زمین پہ غالب ہو جائے تم لوگ دنیا کا مال چاہتے ہو حالانکہ اللہ آخرت (انجام) چاہتا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے اگر اللہ کی طرف سے مشیت سبقت نہ کر چکی ہوتی تو جو تم کرنے لگے تھے

اس کی بڑی سزا ہیں تم ہی گرفتار ہو جاتے۔

ہمارے مفسرین و اہل سیر سے یہاں چند فاش غلطیاں ہوئی ہیں۔ پہلے وہ سن لیجئے:

(۱) پہلی غلطی یہ ہے کہ یثخن فی الارض میں اثخان کے معنی انہوں نے خونریزی کے لے لئے اور نتیجہ یہ نکالا کہ قیدیانِ بدر کو قتل کر دینا چاہیئے تھا۔ لہٰذا حضرت عمرؓ کی رائے صحیح تھی۔ تعجب ہے کہ سیرۃ النبی کے مؤلف نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: "بغیر اچھی طرح خونریزی کرنے کے"..... اور دوسری جگہ ہے..... "تا آنکہ خوب زمین لڑ لے"... حالانکہ اثخان کے معنی نہ لڑنے کے ہیں نہ قتل کرنے کے۔ اس کے معنی ہیں کسی کو کمزور کر دینا اور اس پر غالب آ جانا۔ اس کی تائید خود قرآن سے ہوتی ہے جہاں سورۂ محمدؐ میں فرمایا گیا ہے:

حتیٰ اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق — یہاں تک کہ جب تم ان پر غالب آ جاؤ تو انہیں قید کر لو۔

ذرا سوچنے کی بات ہے کہ اگر اثخان کے معنی قتل کرنے کے لئے جائیں تو یہ حکم کتنا بے جوڑ ہو جائے گا کہ "جب انہیں قتل کر چکو تو انہیں قید کر لو" غرض اس آیت کا مفہوم صرف اسی قدر ہے کہ جب تک دشمن کا زور اچھی طرح نہ توڑ دو اس وقت تک قیدیوں کو حصول زر کا ذریعہ بناؤ کیونکہ تمہارا مقصد حصول زر نہیں بلکہ غلبۂ دین ہونا چاہیئے۔

(۲) دوسری غلطی یہ ہوئی ہے کہ اہل سیر و تفسیر نے اس آیت کو قیدیانِ بدر پر چسپاں کر دیا ہے اور اس کی تائید میں روایتیں بھی بن گئی ہیں۔ حالانکہ اس کا تعلق قیدیانِ بدر سے نہیں بلکہ ابوسفیانی قافلۂ تجارت سے ہے جس کا تفصیلی ذکر اوپر آ چکا ہے اور جسے قرآن احدی الطائفتین اور غیر ذات الشوکۃ کہا ہے۔ جیسا کہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں بعض مسلمانوں کی یہ خواہش تھی کہ ابوسفیانی قافلۂ تجارت میں ایک تو چالیس آدمی ہیں اور دوسرے مال و اسباب بے اندازہ ہیں۔ اگر سو مسلمان بھی نکل کھڑے ہوں تو ان کو گھیر کر مال و اسباب آسانی سے لوٹ لیں گے اور باقیوں کو قیدی بنا لیں گے۔ پھر انہی قیدیوں کے ذریعے بے شمار زر فدیہ بھی ہاتھ آ جائیگا۔ ان مسلمانوں کی تجویز دنیاطلبی (عرض الدنیا) کے لحاظ سے تو بڑی پرکشش اور درست تھی لیکن اسلام کے بلند ترین نصب العین اور اخلاقی قدروں کو دیکھتے ہوئے

یہ اقدام بڑا ہی پست تھا۔ ایک تو مال و دولت کا لالچ اور انتقامی جذبے کی تسکین عالی ظرفی کے خلاف تھی اور دوسرے کسی کو کمزور پا کر دھر دبانا اقدار شجاعت کے مطابق نہ تھا۔ تیسرے اس میں غلبۂ اسلام اور ہزیمتِ کفر کا وہ اعلیٰ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا جو بعد میں فتح بدر سے حاصل ہوا۔ چوتھے حملہ کرنے میں پہل کرنا خود اسلامی قوانین جنگ کے خلاف تھا۔ ایسے اقدامات سے نبوت کی اعلیٰ قدریں مجروح ہو سکتی تھیں اسی لئے ارشاد ہوا کہ:

زمین پر غلبہ حاصل کئے بغیر محض قیدیوں کو حصول زر کا ذریعہ بنانا ایک ایسا اقدام ہے جو کسی نبی کو تو زیب نہیں دیتا یہ تو دنیا طلبی ہے حالانکہ خدا تمہارے لئے آخرت اور حسنِ انجام کو پسند فرماتا ہے۔ یہ تو حسنِ اتفاق تھا کہ جو مقدر تھا وہی ہوا اور تمہیں اس شامی قافلے پر چھاپا مارنے کا موقع ہی نہ ملا ورنہ قدرتی تائید شامل حال ہو کر تمہیں اس اقدام سے نہ بچاتی تو جو تم کرنے لگے تھے اس میں بڑی سخت گرفت سے دوچار ہونا پڑتا۔

یہ ہے اس کا تفسیری ترجمہ۔ اس کا سراسر تعلق قافلۂ ابوسفیان پر چھاپا مارنے سے ہے نہ کہ قیدیانِ بدر سے۔

(۳) ایک تیسری غلطی اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں یہ ہوئی ہے کہ لمسکم فیما اخذتم عذابٌ عظیم میں فیما اخذتم کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ تم نے قیدیانِ بدر سے جو فدیہ لیا ہے اس کی بڑی گرفت ہوتی اگر نوشتۂ تقدیر پہلے سے لکھا نہ جا چکا ہوتا۔ اخذتم کے معنی "تم نے زر فدیہ لیا" نہیں ہے اور نہ یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کے عوض عذابٌ عظیم آتا۔ جنگ کے بعد قیدیوں کا ہونا اور ان سے زر فدیہ لے کر رہا کرنا ایک رسم قدیم تھی اور اسلام نے اسے باقی رکھا ہے اگر کوئی بڑا گناہ ہوتا تو اسے ختم کر دیا جاتا اور اس کی تلافی یوں کی جاتی کہ ..... سب کے فدیے واپس کر دیئے جاتے اور مفسرین کی تفسیر کے مطابق سارے قیدیوں کو قتل کر دیا جاتا۔ یہ کون سی مشکل بات تھی؟ لیکن ہوا یہ کہ زر فدیہ حلال طیب رہا اور قیدی رہا کر دیئے گئے اور بہت سے قیدی عرصۂ دراز تک قبضہ میں رہے۔ پھر یہ دعویٰ کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ یہ آیت

قیدیانِ بدر کے متعلق ہے اور ان سے فدیہ لینا اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کا بدلہ عذابِ عظیم ہو تا تھا۔

دراصل یہ مغالطہ "اخذتم" سے پیدا ہوا ہے جس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے کہ "تم نے جو زرِ فدیہ حاصل کیا ہے" حالانکہ اخذتم کے یہاں یہ معنی نہیں۔ اخذ، طفق، جعل، انشاء وغیرہ ماضی ابتدائی[5] جاننے کے لئے آتا ہے اخذ یصنع (کرنے لگا۔ طفق یبکی: رونے لگا جعل یضحک۔ ہنسنے لگا انشاء یقول: کہنے لگا۔ یہاں اخذتم سے مراد ہے خذتم تصنعون یا تفعلون یعنی جو تم کرنے لگے تھے۔ جو تم عنقریب کرنے والے تھے۔ مطلب یہ ہے جو کام (قافلہ ابوسفیان کو لوٹنے کا) کرنے لگے تھے وہ تمہارے مقاصدِ عالیہ اور سیرتِ اسلامیہ کے اس قدر خلاف تھا کہ اس سے تم میں اور دوسرے عرب کے جاہل لٹیروں میں کوئی فرق نہ رہتا اور اس سے تمہارے اعلیٰ نصب العین مٹی میں مل جاتے کیونکہ اس سے کوئی دینی فائدہ حاصل نہ ہوتا، کوئی تبلیغ حق نہ ہوتی، کوئی شجاعت کا مظاہرہ نہ ہوتا، کوئی اعلیٰ اقدار قائم نہ ہوتیں۔ صرف ہوسِ انتقام کی تسکین ہوتی، آغازِ حملہ نہ کرنے کی اخلاقی قدر مجروح ہوتی، ہوسِ زر اور لوٹ مار کا جاہلانہ اظہار ہوتا اور سب سے بڑھ کر اہلِ کفر کا زور نہ ٹوٹتا بلکہ اہلِ کفر کو یہ طعنہ دینے کا موقع ملتا کہ دین کا ڈھونگ محض کمزوروں کو لوٹنے کے لئے رچایا گیا ہے نیز اس حرکت سے بجا طور پر اہلِ کفر کا جوشِ انتقام بھڑک اٹھتا اور تاریخ ان کے جوابی حملے کو حق بجانب ٹھہراتی۔ پس ایسی شدید غلطی کے عوض عذابِ عظیم کا نازل ہونا تو سمجھ میں آسکتا ہے لیکن زرِ فدیہ لینے کو عذابِ عظیم کا موجب سمجھنا، وہ بھی اس کے جواز کو باقی رکھتے ہوئے۔ بڑی مشکل سے سمجھ میں آسکتا ہے

(۴) ایک چوتھی غلطی، لولا کتٰب من اللہ سبق کی تفسیر میں ہوئی۔ سیرت نگار اور تفسیر نگار

---

[1] میں نے اپنے شاگردوں کو ماضی کی سات قسمیں پڑھائی ہیں۔ ماضی[1] مطلق: فعل (اس نے کیا)، ماضی[2] قریب: قد فعل (اس نے کیا ہے)، ماضی[3] بعید: کان فعل (اس نے کیا تھا)، ماضی[4] استمراری: کان یفعل (وہ کرتا تھا یا کر رہا تھا)، ماضی[5] تمنائی: لیتما یفعل (کاش وہ کرتا)، ماضی[6] احتمالی یا شکی۔ لعلما فعل (شاید اس نے کیا ہوگا)، ماضی[7] ابتدائی اخذ یفعل یا جعل یفعل وغیرہ (وہ کرنے لگا)۔

"تقدیر" کے گورکھ دھندوں میں تو پھنس گئے لیکن انھوں نے کسی لگتی ہوئی بات کی کوئی وضاحت نہیں کی مولانا سید سلیمان ندوی سیرت النبی ص۳۴۲ میں اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

اگر خدا کی تقدیر پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو تم نے جو قیدیوں سے لیا ہے اس پر دردناک عذاب پہنچتا۔

ذرا غور کر کے بتایئے کوئی بات سمجھ میں آتی ہے؟ آخر وہ کیا "نوشتۂ تقدیر" تھا جس کی وجہ سے یہ عذاب عظیم آ گیا اور یہ عذاب عظیم کس جرم کے عوض میں تھا؟

یہاں فرمنی تقدیر وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں یہ نوشتۂ الٰہی ہے جو یوں ہے:

واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین	وہ وقت یاد کرو جب خدا تم سے دو گروہوں
انہا تکون لکم وتودون ان غیر ذات	(ابوسفیانی قافلہ تجارت اور بدری لشکر قریشی) میں سے
الشوکۃ تکون لکم ویرید اللہ ان یحق	ایک کا وعدہ فرما رہا تھا کہ وہ تمہارے لئے ہوگا تم تو
الحق بکلمٰتہ ویقطع دابر الکافرین	بے خوشہ گروہ کو اپنے لئے پسند کر رہے تھے مگر اللہ
	یہ چاہتا تھا کہ بدر کے لشکر قریشی کو ہزیمت دلوا کر اپنے
	"کلمات" سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ
	کر رکھ دے۔۔۔۔

یہ ہے وہ نوشتۂ الٰہی جسے نوشتۂ تقدیر" کا گورکھ دھندا بنا دیا گیا ہے۔ بات صاف ہے کہ بعض مسلمان قافلے پر حملہ کرنا چاہتے تھے اور خدا نیز اس کا رسول بھی دوسرے موقع (بدر) پر کفر کی جڑیں کاٹ ڈالنا چاہتا تھا۔ خدا اور اس کے رسول کا یہی فیصلہ تھا یہی نوشتۂ الٰہی ہے جو وقوع پذیر ہوا اور۔۔۔۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور اس کی بجائے قافلۂ ابوسفیان کو لوٹا جاتا تو ساری اقدار اسلامی ختم ہو جاتیں اور ظاہر ہے کہ اس کے عوض عذاب عظیم نازل ہوتا کیونکہ اس سے پندرہ سال کی مسلسل نبوی جدوجہد بے نتیجہ ہو جاتی۔ جو جو مصیبتیں جھیل کر حضورؐ نے ایک امّت قائم فرمائی تھی اور جن جن اقدار عالیہ کی اقامت کے لئے ان کو تیار کیا تھا وہ سب اس ذرا سی غلطی سے خاک میں مل جاتیں اور اس کا نتیجہ عذاب عظیم کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

غرض آیت زیر بحث ـــــ ما کان لنبیٍّ ان یکون لهٗ اسریٰ الخ ـــــ کا کوئی تعلق قیدیان بدر سے نہیں اس واقعہ کو خواہ مخواہ سیدنا عمرؓ کے فضائل میں بیان کیا جاتا ہے۔ آپ کے فضائل تو ان گنت ہیں لیکن اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ایک خلاف واقعہ فضیلت کو بھی آپ کی ذات گرامی سے چپکا دیا جائے۔ اس واقعے میں جو فضیلت سیدنا عمرؓ کی ہے وہ دوسری روایت میں موجود ہے اور اس میں سیدنا ابوبکرؓ بھی شریک ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے فدیہ لے کر قیدیوں کو رہا کرنے کی رائے دی اور حضرت عمرؓ نے ان سب کو قتل کرنے کی رائے دی تو حضورؐ نے فرمایا کہ:

اے ابوبکرؓ! تمھاری مثال (رحم و کرم میں) ابراہیم و مسیح جیسی ہے۔ ابراہیم نے فرمایا تھا کہ.... ومن عصانی فانّک غفور الرحیم (اگر کوئی میری نافرمانی کرتا ہے تو تو غفور الرحیم ہے) اور مسیحؑ نے فرمایا تھا...... وان تغفر لهم فانّک انت العزیز الحکیم (اگر تو ان کی مغفرت فرمادے تو تو عزیز و حکیم ہے) اور اے عمرؓ! تمھاری مثال نوح اور موسیٰ جیسی ہے۔ نوح نے کہا تھا ربّ لا تذر علی الارض من الکفرین دیارا۔ (اے خدا ان نافرمانوں کو زمین پر زندہ نہ چھوڑ) اور موسیٰ نے کہا تھا ربنا اطمس علی اموالهم.... (اے ہمارے رب تو ان کے اموال کو بھی مٹا کر رکھ دے۔) رواہ الترمذی واحمد۔

۲۔ نزول ملائکہ

غزوۂ بدر کے بیان کے سلسلہ میں نزول ملائکہ کا بھی بڑے اہتمام سے ذکر کیا گیا ہے[1] ارشاد:

اذ تستغیثون ربّکم فاستجاب لکم انّی ممدکم بالف من الملٰئکة مردفین .... اذ یوحی ربّک الی الملٰئکة انی معکم فثبتوا الذین آمنوا ....

وہ وقت یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری سن لی کہ لگاتار ہزار[2] فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا .... وہ وقت یاد کرو جب تمہارا رب ملائکہ کی طرف یہ وحی کر رہا تھا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں پس اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو۔

---

[1] یہاں سے آگے جو تخاطب ہے سألقی فی قلوب الذین کفروا الرعب فاضربوا الخ وہ مسلمانوں سے ہے۔

[2] دوسری جگہ تین ہزار اور پانچ ہزار فرشتوں کے ذریعے مدد کا بھی ذکر ہے یہاں سب کا ذکر مقصود نہیں۔

ان آیات میں فرشتوں کے نزول اور ان کے سپرد کردہ فریضے کا ذکر ہے۔ ہزار فرشتوں کے نزول کی کیفیت ہمارا دماغ نہیں سمجھ سکتا۔ بس ہم زیادہ سے زیادہ اتنا سمجھ سکتے ہیں کہ ہمیشہ انسانی مقاصد کی کامیابی اور ناکامی میں بہت سی غیر مرئی قوتیں کام کرتی رہتی ہیں۔ آپ کہیں گے کہ ہمت یا بزدلی بھی جنگ میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ ٹھیک ہے لیکن یہ غیر مرئی کیفیات کہاں سے اور کس طرح پیدا ہوتی ہیں؟ ایک قلیل التعداد گروہ میں جرأت و ہمت اور کثیر التعداد فراواں اسلحہ لشکر میں بزدلی، کمزوری کہاں سے آجایا کرتی ہے؟ ان مختلف قلبی کیفیات کی تخلیق تو خدا کی طرف سے ہوتی ہے لیکن ان کے لئے اس نے ذریعہ یا AGENCY جن غیر مرئی قوتوں کو بنایا ہے وہی فرشتے ہیں۔ انسانی دماغ کے لئے ملکی حقیقت کو اس سے زیادہ سمجھ سکنا مشکل ہے۔ ایسی تائیدات غیبی کی توجیہات کو مادی نقطۂ نظر سے کس طرح سمجھا جا سکتا ہے؟

(۳) غلبۂ خواب اور بارانِ رحمت

نیند آجانا اور پھر دور دراز مسافت طے کرنے والے مسافروں کو نیند کا آجانا کوئی ایسی چیز نہیں جس کا خاص طور پر ذکر کیا جائے لیکن قرآن نے اس کا ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میدان جنگ سامنے ہو اور دشمن کے لشکر، اسلحہ اور رسد سے چند ہوں اور ایک اعلیٰ ترین مشن کی فنا و بقا کا سوال درپیش ہو تو نیند کا آجانا یقیناً ایک غایت درجے کے سکون، اطمینان اور اعتماد و بے خوفی کی دلیل ہے اور یہ ایسا انعام الٰہی ہے جس کا ذکر خاص طور پر قرآن میں یوں کیا گیا ہے:

اذ یغشیکم النعاس امنۃً منہ و	وہ وقت یاد کرو جب خدا تم پر تمہارے چین کے
ینزل علیکم ..... الخ	لئے اپنی طرف سے اونگھ طاری کر رہا تھا اور ....

یہ واضح رہے کہ یہاں خواب غفلت یا گہری نیند کا ذکر نہیں بلکہ صرف نعاس کا ذکر ہے جس کے معنی آنکھ یا جھپکی کے ہیں اور یہ نیند کا بالکل ابتدائی زینہ ہوتا ہے اس قلیل مگر گہری جھپکی نے اہل اسلام کے اندر ایک کایا پلٹ کر دی کہ جاگے تو بالکل تازہ دم تھے۔

اس کے ساتھ ہی قرآن نے ایک اور انعام کا بھی ذکر فرمایا ہے اور وہ ہے بارانِ رحمت کا نزول۔ اس کا ذکر یوں ہے۔

وینزل علیکم من السماء ماء لیطھرکم	اور وہ تم پر بلندی سے پانی برسا رہا تھا تاکہ تمہیں اس کے
بہ ویذھب عنکم رجز الشیطان ولیربط	ذریعے پاکیزہ بنا دے اور تم سے شیطانی پلیدی کو دور کر دے
علی قلوبکم ویثبت بہ الاقدام ہ	اور تمہارے دلوں کو مضبوط کرے اور تمہارے قدم جما دے۔

پانی کا سیدھا سا مقصد پیاس بجھانا ہوتا ہے لیکن یہ چونکہ محض حیوانی ضرورت ہے اس لئے قرآن نے صاف لفظوں میں اس کا ذکر مناسب سمجھا اور دوسرے اعلیٰ مقاصد کا ذکر کر دیا ہے۔ پہلی چیز ہے طہارت جس کی ہر مومن کو ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری چیز ہے شیطانی پلیدی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا مفہوم غسل جنابت ہو یا وہ مایوسانہ جذبات ہوں جو ایسے بے آب و گیاہ سرزمین میں پیدا ہو سکتے ہوں خصوصاً اس وقت جب کہ کنوئیں پر دشمن کا قبضہ ہو۔ اس کے علاوہ بعض لوگوں نے اس سے مراد پیاس بھی لی ہے کیونکہ "شیطان الفلاۃ" (صحرا کا شیطان) شدت کی پیاس کو بھی کہتے ہیں۔ تیسری شے ہے دلوں کی ڈھارس بندھنا اور پانی کا ایک بہت بڑا سہارا ہاتھ آ جانے سے ڈھارس بندھ جانا آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ چوتھی چیز ہے قدم جمنا۔ یہ ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے ہوا۔ جس طرف مسلمان تھے (جسے قرآن نے العدوۃ الدنیا کہا ہے) ادھر کی زمین گرد و غبار جمنے سے ایسی ہموار ہو گئی جس پر قدم دھنسنے نہ پائیں اور باطنی حیثیت سے یہ تمام تائیدات غیبی نے ان کے قدم جما دیئے۔

ہم حقیقت کے خلاف تعداد کا نظر آنا۔

قرآن نے ایک اور عجیب چیز بتائی ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کی نگاہ میں کمتر نظر آ رہے تھے۔ ارشاد ہے:

اذ یریکھم اللہ فی منامک قلیلاً ولو اراکھم کثیراً لفشلتم ولتنازعتم فی الامر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واذ یریکموھم اذا التقیتم فی اعینکم قلیلا

ويقللكم في اعينهم . . . .

وہ وقت یاد کرو جب اے رسول تمھیں خدا خواب میں ان کو تھوڑا کر کے دکھا رہا تھا اور اگر وہ زیادہ کر کے دکھاتا تو تم ڈھیلے پڑ جاتے اور مقابلہ دشمن کے معاملہ میں باہمی جھگڑا کرنے لگتے . . . . وہ وقت بھی یاد کرو جب تمھاری مڈبھیڑ ہوتی تو اللہ ان دشمنوں کو تمھاری نگاہوں میں کم کر کے دکھا رہا تھا۔

گویا مسلمانوں کو اہل کفر اپنی اصلیت سے کم تر دکھائی دے رہے تھے یعنی تین گنے کی بجائے صرف دو گنے۔ اسی کو یوں کہا گیا ہے کہ یرونہم مثلیہم رأی العین — اور اسی طرح کفار کو اہلِ اسلام کم تر نظر آ رہے تھے۔ اور اس کی غرض یہ تھی کہ ہونے والی بات ہو کر رہے۔ (لیقضی اللّٰہ امرًا کان مفعولا) اس کا نتیجہ قدرتہً یہ ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کو ہیچ سمجھ رہے تھے اور اس کا اثر یوں ظاہر ہوا کہ اہل کفر بھی بے جگری سے لڑے اور اہل اسلام بھی۔ اگر دونوں ایک دوسرے کو اصلیّت سے زیادہ نظر آتے تو دونوں ایک دوسرے سے خائف ہو جاتے اور ممکن تھا کہ جنگ ہوتی اور غلبۂ اسلام کو کفر کا زور توڑنے کا موقع نہ ملتا۔ لیکن چونکہ ہر ایک فریق کو دوسرے نے کمتر محسوس کیا اس لئے آسانی سے نگلا جانے والا لقمۂ سمجھ کر خم ٹھونکتا ہوا میدان میں نکل آیا اور جس زور کی ٹکر ہوئی اسی زور کا صدمہ بھی کفر کو برداشت کرنا پڑا۔

یہ کمتر نظر آنے کا معاملہ بظاہر تو تعداد سے متعلق دکھائی دیتا ہے لیکن اگر اسے قوت کی کمی سے تعبیر کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، مسلمان تو یوں بھی تعداد میں کم تھے، دوسرے بے سروسامان تھے تیسرے وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ مسلمان آج تک کسی موقع پر ہم سے مقابلہ نہ کر سکے یہاں تک ہم نے ان کو مکّہ سے نکال باہر کیا۔ وہ اسے صبر واستقامت نہیں بلکہ مسلمانوں کی کمزوری سمجھ رہے تھے۔ یہ تمام اسباب مسلمانوں کو ہیچ تر سمجھنے کے لئے کافی تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے لئے بھی کفار کو ہیچ تر سمجھنے کے کافی اسباب موجود تھے۔ اہل کفر تعداد میں تو دوگنے دکھائی ہی دے رہے تھے اور یہ حقیقت کے خلاف بھی نہ تھا وہ زیادہ تھے لیکن اہل کفر کو ہیچ تر سمجھنے کے اسباب یہ تھے کہ ان کے پاس

قوتِ ایمان نہ تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محمدؐ جیسا محکم سہارا ان کے پاس نہ تھا جو خدا کو بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے اور فتح و نصرت کی بشارتیں بھی۔ یہ غیر معمولی قوت بجائے خود اتنی زیادہ حوصلہ افزا تھی کہ اگر دشمن دس گنے بھی ہوتے تو انہیں تھوڑے دکھائی دیتے۔

غرض قلیل یا قلّت کا لفظ محض کمیت کے لئے نہیں ہوتا بلکہ کیفیت کے لئے بھی اسی طرح مستعمل ہے، اس لئے اسے "تقدیر بدر" جیسا کرشمہ ماننا ضروری نہیں بلکہ ایک ایسا اسوۂ نمونہ ہے جو ہر دور میں اہل صبر و تقویٰ کے ساتھ وابستہ رہے گا۔

عمیر بن وہب کا اسلام

رات کی تاریک تنہائی میں مقام حجر کے پاس صفوان بن امیہ اور عمیر بن وہب باتیں کرتے ہیں۔ مقتولانِ بدر کی یاد میں سوگواری کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ صفوان کا باپ امیہ بدر میں مارا گیا تھا۔ اور عمیر بن وہب کے فرزند وہب بن عمیر بدر کے قیدیوں میں تھے۔ اتنے میں عمیر نے کہا کہ "بخدا اب تو زندگی بے کیف سی ہو گئی ہے اگر مجھ پہ قرض نہ ہوتا اور بال بچوں کی ذمہ داری نہ ہوتی تو میں مدینے جا کر محمدؐ کا قصہ ہی پاک کر دیتا۔ صفوان نے کہا کہ تمہارا قرض اور کفالتِ عیال میرے ذمے رہی۔ عمیر نے گھر آ کر ایک خنجر زہر میں بجھایا اور مدینے کی طرف چل پڑا۔ اونٹ سے اترا تو حضرت عمرؓ کو کچھ شک گذرا اور آپ کی رائے سے بہت سے صحابہ حضورؐ کے گرد حلقہ باندھ کر حفاظت کے لئے بیٹھ گئے۔ عمیر آ کر حضورؐ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور گفتگو یوں شروع ہوئی۔

عمیر: انعم صباحاً یا محمدؐ۔ صبح بخیر یا محمدؐ

حضورؐ: قد ابدلنا اللّٰہ خیراً منہا ما اقدمک؟ اللہ نے اس سے بھی بہتر صبح بخشی ہے۔ اچھا تم یہاں کس سلسلہ میں آئے ہو؟

عمیر: جئت افدی اسارٰی الکم۔ قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے رہا کرانے کے لئے

حضورؐ: ومال السیف؟ یہ تلوار کیسی ہے؟

عمیر: اما انّا قد حملناہا یوم بدر فلم یفلحن ولم ینجحن۔ ہم نے تو بدر میں

بھی یہ تلواریں سنبھالی تھیں لیکن یہ نہ کام آئیں نہ کارگر ثابت ہوئیں۔

حضورؐ: ثم ماشیٔ؟ قلت لصفوان وانساباالحجر لولا عیالی ودینی لکنت انا الذی قتلت محمداً ابن عنی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا جب تم اور صفوان حجر کے پاس اکٹھے بیٹھے تھے تو تم نے صفوان سے کیا کہا تھا؟ یہی ناکہ اگر میرے بال بچے نہ ہوتے اور مجھ پہ قرض نہ ہوتا تو میں اپنے ہاتھ سے جا کر محمد کو قتل کر دیتا؟

عمیر: ھا کیف قلت؟ ذرا پھر فرمایئے کیا باتیں ہم دونوں میں ہوئیں؟ حضورؐ نے پھر اس سازش کی تفصیل کو دہرایا۔ اس کے بعد وہب نے کہا: کنت تخبرنا خبر اھل الارض فکذبک فارات تخبر خبر اھل السماء۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ وانک رسول اللہ۔ حضورؐ زمین والوں کی باتیں بتاتے تو ہم جھٹلاتے تھے لیکن اب تو میں یہ دیکھتا ہوں کہ حضورؐ آسمان والوں کی باتیں بھی بتلانے لگے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں اور آپ اس کے رسول ہیں

اس کے بعد وہب کی درخواست پر حضورؐ نے اپنی دستار مبارک عطا فرما دی جسے وہ لے کر مکہ لوٹ آئے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب عمیر مدینے میں آیا ہے تو اس وقت میری نگاہوں میں خنزیر سے بھی زیادہ بدتر تھا لیکن جب وہ واپس گیا ہے تو وہ مجھے اپنی اولاد سے زیادہ پیارا تھا۔ اس کے بعد حضورؐ نے ان کے فرزند وہب بن عمیر کو بغیر فدیے کے رہا کر دیا۔ اور یہ دونوں مکہ آ گئے اس کے بعد عمیر نے مکہ میں تبلیغ اسلام شروع کر دی اور بہت سے لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام کر لیا۔

(بروایت حضرت انس) طبرانی نے کبیر میں ان کا نام وھب بن عمیر بتایا ہے نیز انہوں نے واقعہ بدر میں ان کے اسلام قبول کرنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن طبرانی کے الفاظ صاف ہیں کہ کان وھب بن عمیر شھد احدا کافرا یعنی وہب بن عمیر بحالت کفر احد کے دشمن کیمپ میں تھے اور شدید زخمی ہونے کے بعد اچھے ہو گئے تھے۔ لہٰذا معلوم یہ ہوتا ہے کہ غزوہ احد کے بعد یہ ایمان لائے ہیں نہ کہ بدر کے بعد۔ واللہ اعلم۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ پیغمبر کو اللہ تعالیٰ بہت سے غیوب پر مطلع کر دیتا ہے اور جب حجابات اٹھتے ہیں تو ایسی بہت سی محیر العقول باتیں باذن الٰہی بتا دیتا ہے۔ یہ چیزیں مادہ پرستوں کی سمجھ میں مشکل ہی سے آتی ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ یہ حضرات TELEPATHY کو ایک عملی فن کی حیثیت سے مان لیتے ہیں اور نبوت کی اس قوت کو تسلیم کرنے میں انہیں تامل ہوتا ہے۔ دوسری طرف ایسے واقعات کو اس قدر بلند مقام دے کر بیان کیا جاتا ہے کہ گویا حضورؐ کے لئے یہ بڑا شرف ہے حالانکہ؛

در دلِ ہر کس کہ دانش راہ مزاست

روئے و آواز پیمبر معجزا است

اس قسم کی قوتیں تو حضورؐ کے ادنیٰ سے ادنیٰ کفش برداروں میں متواتر ثابت ہیں اور حضورؐ کے لئے تو یہ کوئی اہم چیز ہی نہیں۔

تشبیہاتِ رومی

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

مولانا جلال الدین رومی تشبیہ و تمثیل کے بادشاہ ہیں وہ ہر قسم کے اخلاقی و روحانی مسائل کو سلجھانے اور ہر باریک نکتے کی وضاحت کرنے کیلئے ایسی دلنشیں تشبیہہ دیتے ہیں جو یقیناً آفرین طلب ہوتی ہے اور مسلمہ ادبی موضوعات کے مشہور عالم اور نامور مفکر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے ان تشبیہات کی بڑے دلکش اور وجد آفریں انداز میں تشریح کی ہے اور ان کی یہ تصنیف حکمت و معرفت کا ایک بحر ذخار ہے جس کی اشاعت سے اردو زبان کے افادی ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

خوشنما ٹائپ، دیدہ زیب طباعت عمدہ کاغذ ـــــــ قیمت دس روپے

ملنے کا پتہ:۔ سکریٹری ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور